

الایمان والحیات

[یہ مضمون مشہور عرب عالم دین شیخ یوسف قرضاوی کی کتاب الایمان والحیاء کے چند

ابواب کی تلخیص اور ترجمہ ہے]

ایمان محض دعویٰ کا نام نہیں۔ کسی شخص کا زبان سے یہ اعلان کر دینا کہ وہ مومن ہے اُسے مومن نہیں بنا دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَيَا لَيْسَ لَهُ الْآخِرُ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ اور کہتے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایماندار نہیں۔ اسی طرح مومنوں کے اعمال سے ملتے جلتے اعمال اختیار کر لینے کو بھی ایمان سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بعض رجل و فریب کے علمبردار نیک اعمال کو شعرا بنائیتے ہیں حالانکہ ان کے دل صلاح و خیر سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ذہنی طور پر بعض حقیقتوں کی معرفت حاصل کر لینے کو بھی ایمان کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ دلائل و براہین کی رو سے حقائقِ ایمان کے قائل ہو چکے ہوتے ہیں مگر تکبر، حسد یا محبتِ دنیا اُن کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ وَحَدُّوا بِهَا وَاسْتَفْتَيْتُمُ الْكُفَّارَ عَمَّا كَانُوا مِن بَيْنِ يَدَيْهِمْ

ایمان درحقیقت ایک ایسا اخلاقی اور روحانی عمل ہے جو دل و دماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر و نفوذ رکھتا ہے۔ اور انسان کے ارادہ و اختیار، عقل و شعور اور وجدان — ہر ایک چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ وحی و الہام کی مدد سے انسان پر حقائقِ وجود کا انکشاف کرتا ہے اور یہ انکشاف محض علم کی حد تک ہی نہیں رہتا بلکہ جزم و یقین سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اور پھر ربی شکل کا کوئی حملہ بھی اس کے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ اِنَّهَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ

ثُمَّ لَمْ يَزَالُوا ۖ واصل ایماندار وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے۔ حقائق کا یہ یقینی علم جو کسی انسان کو ایمان کی بدولت نصیب ہوتا ہے۔ اس کے دل کو ذات حق کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کے ارادہ و اختیار کو وسیع و طاعت سکھاتا ہے اور اس کے تکبر و غرور کو خضوع خضوع میں بدل دیتا ہے۔ اور بالآخر گوشت پرست کا یہ مجسمہ تسلیم و رضا کا پیکر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد معرفت حق انسان کے اندر حرارت عمل پیدا کرتی ہے۔ اور عقیدہ و ایمان کے مقتضیات کی تکمیل کے لیے اسے سرگرم بنا دیتی ہے۔

ایک مومن کی زندگی کا یہی پہلو ہے۔ عملی پہلو۔ جسے قرآن خوب نمایاں کر کے اور پورے زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مومن کی زندگی محاسب اعمال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ بہترین اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ خوفِ خدا سے اس کا دل معمور ہوتا ہے۔ مصائب و مشکلات میں صبر و استقامت سے کام لیتا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور اتیانِ زکوٰۃ نیز صیام و حج کے فرائض خلوصِ دل سے بجا لاتا ہے۔ جانِ مال سے خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ فواحش و منکرات اور لغو اور لابیئی امور سے قطعی پرہیز کرتا ہے۔ دن کی مصروفیتیں ہوں یا رات کی خلوتیں، سب میں یادِ الہی اور لیت کا مقام رکھتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی دستکش نہیں ہوتا۔ خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ عہد و پیمان کی پابندی کرتا ہے۔ ہر ایک سے لطف و محبت سے پیش آتا ہے۔ اور اخوت و مودت کا برتاؤ کرتا ہے۔ غرض بندہ مومن ہر شعبہ زندگی میں تقاضائے ایمان کو عملاً پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لوحِ سہمی سے کفر و جاہلیت کا ایک ایک نقش مٹا کر چھوڑتا ہے۔ وہ ہدایت و ضلالت میں کبھی مصالحت کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ معصیت و طغیان کے بارے میں تساہل اور ملامت سے کام لیتا ہے۔ اور جب تک اس اپنے دائرہ اختیار میں بُرائی کا سرکھل نہیں دیتا اُسے چین نہیں آتا۔

عقیدہ و رائے کا فرق بعض لوگ عقیدہ و ایمان کو فکر و نظر اور خیال و رائے کے معنی میں لیتے ہیں۔ حالانکہ عقیدہ و رائے میں بہت بڑا فرق ہے۔ رائے انسان کے دائرہ معلومات میں ایک چیز کے اضافہ کا نام ہے جبکہ عقیدہ اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا اور اسے سرگرم عمل رکھتا ہے۔ اس کی ہڈیوں کے گہرے اندر دل کی گہرائیوں میں جڑا ہوا ہے۔ صاحبِ رائے کی حیثیت

ایک فلسفی کی سی ہوتی ہے جو ایک بات کو درست سمجھ لیتا ہے حالانکہ وہ حقیقتاً غلط ہوتی ہے۔ آج ایک چیز کے حق میں دلیل دیتا ہے اور اگلے ہی دن اس کے برعکس موقف اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صاحب عقیدہ یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ وہ شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کا عقیدہ حق ہوتا ہے، آج بھی حق اور کل بھی حق۔ وہ دلیل کی زد سے باہر اور ظن و تخمین کی سطح پرست سے بہت بلند ہوتا ہے۔ صاحب راستے کے لیے مفاد یا مصلحت کے زیر اثر بدل جانا بڑا آسان ہوتا ہے لیکن صاحب عقیدہ اس کردار کا منظر ہوتا ہے کہ ”اگر میرے دانتیں ہاتھ پر سورج اور باتیں پر چاند بھی لا کر رکھ دو اور جس پیغام حق کو لے کر میں آیا ہوں اس سے دست بردار ہونے کے لیے کہو تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اور میں اپنے مشن کو ہرگز ترک نہیں کر سکتا۔“ راستے کی مثال ایک بے حس و حرکت جسد کی ہے اور عقیدہ اس میں روح حیات پھونکتا ہے۔ راستے ایک ناپائدار قطعہ نور ہے تو عقیدہ ایک کوکبِ رخشندہ۔ راستے ایک تاریک غار کی مانند ہے جسے عقیدہ کی روشن شعاعیں منور کرتی ہیں۔ راستے کھرے پانی کا ایک جوہر ہے جس کی سطح پر ہزار ہا حشراتِ اندسے بچے دے دیتے ہیں اور عقیدہ ایک بحرِ زخار ہے جو ایسی کسی مخلوق کو اپنی پُرسور لہروں پر تو الود و ناسل کی اجازت نہیں دیتا۔ راستے شدائد و مصائب کو جنم دیتی، دشوار راہوں کو پیش کرتی، تن و شکم کے امانوں پر کان دھرتی اور تذبذب اور تردد کو ابھارتی ہے اور عقیدہ خطرات کو عبور کرتا ہوا، پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلاتا ہوا، زمانے کا رخ پھیرتا ہوا اور تاریخ کی گردش کو بدلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں خدشات کا نام و نشان نہیں ملتا۔ حزم و یقین کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور روح کی امنگ کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں پاسکتی۔

ایمان کے شتملات | عقیدہ اسلام یعنی ایمان، آسمانی تعلیمات کا اصل الاصول ہے جو اللہ، روزِ آخر، ملائکہ، کُتُبِ الہی اور انبیاء و رسل کی تصدیق سے عبارت ہے۔ اور یہ کوئی نو دریافت چیزیں نہیں بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث ہوئے سب کی تعلیم و تبلیغ کا مرکز و محور یہی عقیدہ رہا ہے۔ ایمان ایک ایسا جوہر ہے جو عہدِ طفلی

۱۔ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے اس وقت کہی جب انہوں نے حضور کو دینی خدمت سے باز رکھنے کی تلقین کی۔

سے لے کر دور کھلت تک انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اس کی زندگی کے ہر گوشے پر نہایت گہرے اثرات مترتب کرتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس سے کائنات کی گرہیں کھلتی ہیں۔ رازِ حیات سے پردہ اٹھتا ہے اور عقل و خرد کی لائیں گتھیاں سلجھتی ہیں۔ اس عقیدے نے فکرِ توحید کو اُن آمیزشوں سے پاک کیا جن سے ہر دور کی ضلالتیں اسے آلودہ کرتی رہیں۔ مقامِ نبوت اور منصبِ رسالت کو اسی نے غلط تصور سے بچایا اور نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آخرت کی جزا و سزا کے بارے میں جاہلوں کے اوبام اور باطل پرستوں کی مغالطہ آمیز رویوں کا انزالہ بھی یہی عقیدہ کرتا رہا۔

اس عقیدہ کے عناصر اساسی تین ہیں (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسالہ (۳) ایمان بالآخرت۔
 ۱۔ ایمان باللہ | ۱، وجود باری تعالیٰ۔ دلائل و براہین سے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ایسی قوت کا رفرما ہے جو اس کی تدبیر و انتظام میں مصروف ہے۔ کسی نے اُسے ”علتِ اولیٰ“ سے موسوم کیا، کسی نے اُسے ”عقلِ اولیٰ“ اور کسی نے ”محکِ اولیٰ“ کا نام دیا کتبِ سماوی میں صفاتِ جمال و جلال کی جامع اُسی ذات کو ”اللہ“ سے تعبیر کیا گیا۔ اس بلند ترین ہستی اور اس عظیم ترین قوت — الہِ عظیم — کی حقیقت کو پالینا ذہنِ انسانی کے بس کی بات نہیں جب انسان خود اپنی ذات اور روح کا فہم حاصل نہیں کر سکا اور برتن و مقناطیس جیسے بہت سے مادی امور کی ننگ نہ نہیں پہنچ سکا تو اللہ العلیٰ و کبیر کی ذات کا عنوانِ حقیقی اس کے لیے کہاں ممکن ہے؟
 ع آدمے نہ رسیدی خدا چہ مے جوی

البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے کرشمے اور اس کی قدرت کے مظاہر ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے وجودِ باری تعالیٰ کا اثبات مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ (۱) ہر موجود کو وجود میں لانے والا اور ہر مخلوق کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیے عقلِ مطالبہ کرتی ہے کہ کائنات کے اس زبردست نظام کے پیچھے کوئی منظم ہو۔ (۲) انسان اپنی فطرت اور اپنے لاشعور میں ایک بلند و برتر ہستی کا تصور موجود پاتا ہے جسے ممکن ہے وہ عیش و عشرت کے ایام میں فراموش کر دے لیکن جو نبی مصائب و شدائد کا نردول شروع ہوتا ہے تو وہ ابھر کر اس کے شعور کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّخِیْبِیْنَ اَکِیْہِ (الروم: ۳۳)۔ قرآنِ تاریخ سے استشہاد کرتا ہے کہ انسانیت کی نجات وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان میں مضمر ہے۔ ایک حیرت ناک تسلسل کے ساتھ تو قیوم تباہ و برباد

ہوتی رہیں مگر کچھ مخصوص لوگ بچا لیے جاتے رہے۔ اگر کوئی حکیم و دانماہستی موجود نہیں تو آخر تاریخ کے صفحات پر ایک ہی طرح کا فیصلہ کیوں ثبت ہوتا رہا؟

رب (اللہ واحد) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ”اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی کئی اللہ ہوتے تو (زمین و آسمان) کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔“ (الانبیاء: ۲۲) ایک اور جگہ فرمایا ”اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اُس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر لگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بنتے ہیں (المومنون: ۹) ان آیات سے بدیہی طور پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور نہ اسے کسی شریک کی ضرورت ہے۔ اور نہ یہ نظام کائنات اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی شریک خدا کی شراکت کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ جب پیدا کرنے، رزق دینے اور اپنی مخلوقات کی مشکلات دور کرنے میں اکیلا ہے تو عبادت بھی اُس اکیلے کی ہوگی۔ اور اطاعت و فرمانبرداری بھی اُسی وحدہ لا شریک کی کی جائے گی۔ اُس بچتا و بے ہمتا کے علاوہ کسی سے ڈرنے یا کسی پر بھروسہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وہ تعلیم ہے — توحید باری تعالیٰ اور تقدیس ذات حق کی تعلیم — جو تمام انبیاء نے بالاتفاق دنیا والوں کو دی۔ اور لا الہ الا اللہ ہی وہ کلمہ اخلاص اور کلمہ تقویٰ ہے جسے اہل اسلام نے حرزِ بیان بنایا ہے۔ لا الہ الا اللہ تمام جباروں، طاغوتی طاقتوں اور معبودانِ باطل کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ یہ وہ عالمی پکار ہے جو انسان کو انسان کی غلامی اور مادہ و طبیعت کی بندگی سے نجات دلاتی ہے۔ لا الہ الا اللہ حقیقی انسانی اخوت، اور سچی عزت و آزادی کی نہایت مضبوط بنیاد ہے۔ یہ الہ حقیقی کا تعلق کسی خاص قبیلے، قوم یا ملک سے نہیں جوڑتی بلکہ اسے ”رب العالمین“ ”رب السموات“، اور رب المشرق والمغرب“ قرار دے کر ہر انسان کو اُسی کا حلقہ بگوش بننے کی دعوت دیتی ہے۔ لا الہ الا اللہ ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کا اظہار ہے جو جاہلی معاشروں سے بالکل مختلف ہوگا۔ عقیدے کے اعتبار سے بھی اور طریق کار کے لحاظ سے بھی۔ یہ معاشرہ نہ مادی ہوگا نہ وطنی اور نہ طبقاتی۔ بلکہ اسے صرف ذات و وحدہ لا شریک سے ایک نسبت خاص ہوگی۔

رج، صفاتِ الہی کا کمال۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ

اس کی جملہ صفات کو کامل و مکمل اور ہر عیب و نقص سے منبرہ ماننا بھی لازم ہے۔ ذاتِ حق کی صفات کے کمال پر کائنات کا ذرہ ذرہ دلالت کرتا ہے۔ موجودات میں سے ہر چیز کی انوکھی اور زری بناوٹ، اس کا ہیکمانہ اور متوازن فروغ و ارتقاء، اس میں حسن و جمال کی کارفرمائی اور اس کی مضبوطی و استحکام ایسی خصوصیات ہیں جو پیدا کرنے والے کی شانِ کمال کا پتہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ زبردست قدرت اور بے پناہ طاقت کا مالک ہے۔ کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا نہ اس کے حکم سے سترابی کر سکتا ہے۔ زندگی، موت، عزت اور ذلت مرت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ حکمت و دانائی کا مبداء و منتہا اور رحمت و رأفت کا منبع وہی ہے۔ اس کی جزا و ثواب اور اس کے انعامات بے حد و حساب ہیں اور اسی طرح اس کا قہر و غضب اور اس کا انتقام بھی اپنی مثال آپ ہے۔

اسلام جس الہ حقیقی سے روشناس ہے وہ کائنات سے بے تعلق الہ نہیں جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے ارسطو کا الہ ہے توہمی لیکن اسے اس جہان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ اس کی طرف متوجہ ہے۔ نہ اس کی تدبیر امر فرماتا ہے اور نہ فرما بھی کیسے سکتا ہے۔ اُسے نہ زمین کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ آسمانوں کے بارے میں۔ وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ اُس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ نہ وہ مُرتب ہے نہ جزء۔ نہ وہ اس عالم میں داخل ہے نہ خارج۔ نہ اس سے متصل ہے نہ منفصل۔ اُس مُحرکِ اول سے نہ کوئی ڈرتا ہے نہ کوئی دلی لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ اُس پر بھروسہ اور اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ یونانیوں کا الہ ایسا ہی تھا اور مغرب کا جدید فکر بھی اسی نوعیت کا الہ رکھتا ہے۔ جس کی سرے سے کوئی صفت ہی نہیں صفت کا نشانِ کمال رکھنا تو بعد کی بات ہے۔ اس کے برعکس اسلام جس الہ پر ایمان رکھنے کی تعلیم دیتا ہے وہ حقیقی و قیوم ہے، علیم بذات الصدور ہے، خالق، مالک اور رازق ہے۔ صاحبِ امر ہے، مُدبّر کائنات ہے اور فعال لما یرید ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ آسمان میں ملائکہ اور زمین پر جن و انس اور دوسری مخلوقات۔ جن و انس کو ارادہ و اختیار عطا کرنے والا اور نسلِ انسانی کو اپنی خلافت و نیابت کا شرف بخشنے والا وہی ہے۔ وہی ہے حیات و موت کا مالک اور حشر و نشر پر قادر۔ لا الہ الا اللہ وَحْدَهُ لَا شَرِیکَ لَهُ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

۲۔ ایمان بالرسالت | اللہ پر ایمان لانے کے بعد، رسولوں پر ایمان کوئی قابلِ تعجب چیز نہیں بلکہ یہ

ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے۔ اس لیے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے لیے موجودات کی تسخیر کے بعد رحمت حق کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اسے صراطِ مستقیم سے ناکشت ناکھ کر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی بلکہ یہ عین تقاضائے حکمت تھا کہ جس ذات نے انسان کو مادی سر و سامان سے نوازا تھا وہ اس کے لیے رُوح کی غذا کا اہتمام بھی کرتی۔ اور جس نے اسے پیدائش کے بعد حیاتِ دنیا سے روشناس کیا تھا وہ موت کے بعد حیاتِ آخرت سے بھی اسے باخبر کرتی۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کا بند و بست نہ فرماتے تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا کہ خواہشات و احساسات رکھنے والی اس مخلوق کے باطنی قویٰ اور خارجی صلاحیتیں خود اسی کی ذات سے اُلجھ کے رہ جاتیں۔ اسی طرح قوم اور جماعت کے اجتماعی اغراض و مصالح بھی تصادم کا شکار ہوتے بغیر نہ رہتے اور یہ صورتِ حال اُس رحمت و عنایت کے منافی ہوتی جس کے تحت تخلیقِ انسان عمل میں آتی تھی۔ اور اس ثمرت و کرامت کے بھی منافی ہوتی کہ جس کی بدولت حضرت انسان کو کائنات میں منفرد مقام عطا ہوا تھا۔ لیکن بعثتِ انبیاء کے اس حقیقی پہلو سے صرفِ نظر کیے ہوئے نوعِ انسانی کی اکثریت، اپنی ہی نوع کے کسی فرد کو منصبِ رسالت پر فائز دیکھ کر اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے حیرت و استعجاب کا اظہار کرتی رہی۔ آكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اِنَّ اَوْحَيْنَا اِلٰی رَسُوْلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ لَّهُمْ قَدَمٌ صَدَقَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط قَالَ الْكَافِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (یونس: ۲)۔

انسان زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے اسے اس کا شعور ہی نہ ہو۔ سب سے پہلے پیدائش کے وقت جب اسے جھوک پیاس کا احساس ہوا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہی تھی کہ جس نے ماں کی چھاتیوں سے اسے غذا حاصل کرنے کی تربیت دی۔ اور ہدایت کی یہ صورت کچھ انسان کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ رَبَّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ حَلَقًا ثُمَّ هَدٰی ۝ (طہ: ۵۰)۔ پھر دوسرے درجے میں ظاہری و باطنی حواس انسان کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور سمع و بصر اور لمس و ذوق کی صلاحیتوں نے اس کے دائرہ معلومات کو کچھ اور وسیع کر دیا۔ اس کے بعد عقل و شعور کی باری آئی اور بلاشبہ یہ وہ نور تھا جس نے بہت حد تک ظلمتِ کدہ حیات میں انسان کی معاونت کی۔ اس کو نفع و نقصان کی معرفت بخشی خیر و شر کی تمیز عطا کی اور اعلیٰ اغراض اور عظیم الشان مقاصد کے حصول کو اس کے لیے ممکن بنا دیا۔ لیکن یہ سارے

ذرائع ہدایت جو بجائے خود ناکزیر اور بہت کچھ نفع بخش تھے ہر لحاظ سے کافی نہ تھے بلکہ اپنے اندر خطا و سہو کا احتمال رکھتے تھے۔ ان سے حقیقت کا کچھ نہ کچھ سرا تو انسان کے ہاتھ لگتا تھا مگر ہر شاہدہ القباس کے بغیر اس کی مکمل دریافت نہ ہوتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کی وہ بہترین شکل اختیار فرمائی جسے وحی کہا جاتا ہے جس نے حیاتِ انسانی کے اُن سرسبزہ رازوں اور مخفی گوشوں سے پردہ اٹھایا جن تک عقل کی رسائی نہ تھی۔ اور جس نے فکر و نظر کی غلطیاں اور حواس کے اور بام کیسر دور کر دیئے اور حق و صداقت کی صاف اور سیدھی شاہراہ پر کاروانِ انسانیت کو گامزن کر دیا۔ لَقَدْ اَوْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحمدید: ۲۵)

ایمان بالرسالت کے مستغنیات (۱) رسالت پر ایمان لانا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور رحمتِ واسعہ پر ایمان لانا ہے۔ کیونکہ حضرت حق کو یہ بات پسند نہ تھی کہ حق ابلاغِ ادائیگے بغیر انسانوں کا احتساب کیا جائے اور انہیں سزا دے ڈالی جائے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (الاسراء: ۱۵)

(ب) ایمان بالرسالت کا ایک اور مفہوم وحدتِ دین کا اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر دوز ہر علاقے اور ہر قوم میں آنے والے انبیاء کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اگرچہ تقاضائے حالات کے مطابق شرائع میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ لَا فَرْقَ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرہ: ۱۷۶)

(ج) انبیاء و رسل، انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں۔ وہ مثالی اذکار سے عبارت تجریدی ہستیاں نہیں بلکہ مکامِ اخلاق اور فضائلِ اعمال کی مظہر زندہ شخصیات ہوتی ہیں۔ اُن کا تعلق کسی مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں بلکہ گوشت پرست کے انسانوں سے ہوتا ہے۔ قرآن اس خیال کی بڑے زور سے تردید کرتا ہے کہ انسانوں کے لیے رسول کوئی غیر انسان ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ رسالت کا جو مفہوم ہمارے دل و دماغ میں اتارتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء نہ خدا ہوتے ہیں نہ خدائی میں شریک ہستیاں اور نہ خدا کی اولاد۔ بلکہ وہ بھی بلحاظ تخلیق عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ وحی نازل کرتا ہے تاکہ وہ نبی و نیک اس کا پیغام پہنچا دیں۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ هُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (ابراہیم: ۱۱)

۳۔ ایمان بالآخرت | کیا داستانِ حیات پس اتنی سی ہے کہ رحمِ مادرِ اگلے دے اور بطنِ گیتی نکلے۔

اور اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو۔ یا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور موت کے بعد ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں“ (المومنون: ۳۷) مگر حقیقت یہی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ہمارے شعور کی گہرائیوں میں اور ہمارے وجدان میں جو زمانہ قدیم سے یہ خیال راسخ چلا آ رہا ہے کہ غایتِ تخلیق یہی چند سالہ زندگی نہیں بلکہ انسان اس دنیا میں ایک مسافر اور مہمان کی طرح ہے جسے جلد ہی اپنے اصلی گھر لوٹ جانا ہے۔ اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ پوری انسانی تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ حیات بعد الموت کا تصور ملتا ہے۔ آخر ذہن انسان پر اس کا تسلط کیوں؟ قدیم مصری اسی خیال کے زیر اثر اپنے مردوں کی لاشوں کو جنوٹ کیا کرتے تھے عقیدہ تناسخ کے پیچھے یہی خیال کارفرما ہے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ایک دوسری زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اور بعض لوگ رُوح کے جسدِ خاکی سے جدا ہو جانے کے بعد اسے بحالتِ تجرد ہی جزا کی لذت اور سزا کی مصیبت سے دوچار سمجھتے ہیں۔ اور کچھ دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد رُوح، موجودہ اجسام سے بہت لطیف مادی پیکر دل میں جلد گر ہو جاتی ہے۔ اور انسانوں کی ایک بڑی تعداد، وحی کے حوالے سے بعث بعد الموت کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ بہر حال خدا کے پرستار، بتوں کے پوجنے والے اور فلسفی سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ مرنے کے بعد فنا نہیں۔ لہذا موت کے بعد زندگی کا یہ شعور جو حکم و بیش ہر دل میں پایا جاتا ہے دسوائے محدود اور مادہ پرستوں کے ایک قلیل گروہ کے، اسے عقل کی گراہی تو نہیں کہا جاسکتا۔ وہم کی پیداوار بھی نہیں۔ پھر آخر یہ ہے کیا؟ اس کی ایک معقول توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک خالص الہامی تخیل ہے جو تخلیق انسان کے وقت خالق نے اس کی فطرت میں ودیعت کیا۔ اور پھر برابر اس کے لاشعور میں جاگزیں رہا۔ انبیاء نے اس مہتمم تخیل کو عقل و استدلال کی روشنی میں حقیقت کا جامہ پہنایا اور وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم پاکر حیات بعد الموت کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ الہامی تخیل کی یہ توجیہ عقل و شعور کو بھی اپیل کرتی ہے اور وجدان بھی گواہی دیتا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ آئیے اس نظریہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کرتے ہیں لیکن قانون کے احتساب سے بالاتر رہتے ہیں، اور بالآخر سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں پر ظلم کر کے

مظلوم کو انصاف اور ظالم کو سزا نہ ملے تو اندھیر گردی کی اس کیفیت پر عقل سرپیٹ کے رہ جائیگی اور تقاضا کرے گی کہ موت کی سرحد پر ہی ہست و بُود کا سارا کھیل ختم نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ ایک اور عالم برپا ہونا چاہیے۔

اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو نیک کام کرتے ہیں۔ بلند مقاصد کے لیے قربانیاں دیتے ہیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جہاد کرتے ہیں لیکن دنیا جہالت یا حسد کی وجہ سے ان کے فضل و شرف کا اعتراف نہیں کرتی اور اچھے اعمال کا دنیا میں انہیں کوئی صلہ نہیں ملتا۔ ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر بتائیے کیا ان نیک افراد کا محروم جزاء رہنا ٹھیک ہے؟ کیا عقل کے پاس اس بے انصافی کا کوئی جواز ہے؟

پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بہت سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، اسے دنیا کا قانون بڑی سے بڑی سزا دیتا ہے اور وہ تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لیکن کیلے شمار لوگوں کے قاتل، لالچہ دار، دھوکا دہیوں کے غاصب اور ان گنت معصوموں پر مظالم ڈھانے والے مجرم کے لیے یہ سزا اُس کے جرائم کی نسبت سے مکمل سزا ہے۔ ایسے شخص کو دنیا میں انصاف کا تقاضا پورا کرنے والی سزا دی ہی نہیں جاسکتی۔ اس کے لیے تو کوئی دوسرا ہی عالم ہونا چاہیے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے اصلاحی کارناموں کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوتے ہیں کہ وہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو سنوار دیتے ہیں۔ اب اگر انسانیت کے ان محسنوں کو اپنے حسنِ عمل کا کوئی بڑے سے بڑا صلہ دنیا میں مل بھی جائے تو کیا وہ مکمل صلہ ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ لہذا ان داعیانِ خیر و صلاح کو مکمل جزا بھی کسی دوسرے ہی عالم میں مل سکتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہی دوسرا عالم عالمِ آخرت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیات بعد الموت کا نظریہ ہی عقلاً صحیح نظر ہے۔

اس کے بعد بعثت بعد الموت کا انکار کیوں؟ کیا مردوں کو دوبارہ جلا اٹھانا کوئی ناممکن اور محال کام ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن دو طرح استدلال کرتا ہے۔ اس کا پہلا استدلال یہ ہے کہ جو ہستی انسان کو عدم سے وجود میں لاسکتی ہے اس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ فَسَيَقُولُونَ مَتَىٰ يَأْتِيهِمْ نَارُ الْقَذِیِّ فَطَرَهُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ ضَرُورٌ لِّوَجْهِیْ گے کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہو وہی جس نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا (الاسراء: ۵۱)۔ قرآن کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ کیا ان لوگوں کو نظر

نہیں آتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے وقت جو نہ تھا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے۔ کیوں نہیں وہ یقیناً ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے (الاحقاف: ۳۳)۔ ان سرچشموں اور ذواضع حقائق کے بعد بھی آخرت کا انکار کرنے والا کوئی بڑا بٹ دھرم اور متعصب انسان ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری زندگی کا باقاعدہ آغاز مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔ سب سے پہلے ہر انسان کی فرد عمل پیش ہوگی اور اللہ تعالیٰ نہایت کڑا احتساب کریں گے اور ہر شخص پر اس کی نیکو کارانہ یا مجرمانہ حیثیت ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر واضح کر دی جائے گی۔ اس کے بعد سعادت مندوں کا گروہ حیات ابدی سے ہمکنار ہو کر باغ بہشت میں پہنچ جائے گا جہاں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے اسباب نعمت مہیا کیے ہوں گے جن سے کوئی آنکھ آشنا نہ ہوگی۔ کسی کان میں ان کی بھنک تک نہ پڑے گی اور کسی دل میں ان کا خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔ دوسری طرف بد نصیبوں کا جہنم غفر جہنم کے ہولناک شعلوں میں پھینک دیا جائے گا جہاں ہر مجرم اپنی سیبہ کاریوں کی پاداش بھگنے گا۔ جہنم کا عذاب مادی و روحانی دونوں طرح کا ہوگا جس کی سختی کا کوئی اندازہ دنیا میں نہیں لگایا جاسکتا، نہ یہاں کی ازیت و لغذیب سے اسے کوئی نسبت ہی ہو سکتی ہے۔ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (الفرقان: ۶۵)۔

ایمان کی امتیازی خصوصیات (i) واضح عقیدہ۔ عقیدہ اسلام (ایمان) میں جو امتیازی صفات پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسرے عقیدہ کو حاصل نہیں۔ یہ ایک واضح عقیدہ ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں۔ اس کی رُو سے اس عجیب و غریب اور محکم و متوازن کائنات کا ایک رب ہے جس نے اسے پیدا کیا اس کا انتظام فرمایا اور اس میں ہر چیز کو ایک انداز سے موجود بنایا۔ اس کائنات کا رب ہی وہ معبود حقیقی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ کوئی شبیہ و مثل نہیں۔ اُس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد۔ البتہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اسی کی ملک ہے اور ہر چیز اسی کے تابع امر ہے نیز اس کائنات میں موجود تنوع اور کثرت کے پیچھے عقل جس وحدت و ارتباط کی طالب ہے وہ واضح طور پر اس عقیدہ میں پایا جاتا ہے۔

(ii) فطری عقیدہ۔ یہ عقیدہ فطرت انسان سے نہ تو غیر مانوس ہے اور نہ اس کے مخالف ہے بلکہ

اُس کی فطرت میں پوری طرح راسخ ہے۔ قرآن میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے ”پس اُسے نبی مکیو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جمادوا اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی سنت بدلی نہیں جاسکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں (الروم: ۳۰)۔ اسی کا مصداق یہ اثر اور رسول بھی ہے۔ ”ہر تہیچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اسلام پر، پھر یہ اُس کے والدین ہوتے ہیں جو اسے یہودی بناتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی پس معلوم ہوا کہ اسلام ایک فطری عقیدہ ہے جو ہر طرح کے خارجی اثرات سے پاک ہے۔

(iii) ثابت و محکم عقیدہ۔ یہ عقیدہ بچائے خود انا مضبوط اور محکم ہے کہ اس میں کسی کی بیشی کی گنجائش نہیں۔ اور نہ کوئی تحریف اور تبدیلی ہو سکتی ہے کوئی بڑے سے بڑا حکم علمی یا دینی مشاورت اس امر کی مجاز نہیں کہ عقیدہ اسلام میں کوئی اضافہ کر سکے۔ یا کسی نئی چیز کو اس کی طرف منسوب کر سکے۔ ایسی ہر کوشش کرنے والے کے منہ پر دے ماری جائے گی ”مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هَذَا مَالِيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ“ (متفق علیہ) قرآن پاک بھی ایسی الحاقی و اضافی کارروائیوں کی صاف صاف تردید کرتا ہے۔ اَمْ لَهُمْ شِرْكُوْا اَسْخَرُوا لَہُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاِذْنَ بِہِ اللّٰہُ (الشوریٰ: ۲۱) یہ کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔ ان نسرہجات کے بعد اس امر میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ بدعت یا کوئی اور چیز از قسم اساطیر و خرافات عقیدہ اسلام میں راہ نہیں پاسکتی۔ اور اگر ایسی کوئی چیز اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ مردود ہوگی اور حجت نہ بن سکے گی۔

(iv) مدلل اور مبرہن عقیدہ۔ عقیدہ اسلام کوئی ایسا عقیدہ نہیں جو یہ کہے کہ ”پہلے مانو پھر جانتے کی کوشش کرو“ یا ”آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلے آؤ“ اس کے برعکس یہ دلائل و براہین پر مبنی عقیدہ ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کو چیلنج کر کے کہتا ہے ”ہَا تُوْبِرْہَا نَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (البقرہ: ۱۱۱)۔ اگر سچے ہو تو واپس لاؤ“ اسی طرح یہ عقیدہ صرف قلب و وجدان کو ہی مخاطب نہیں کرتا نہ ان پر اعتقاد کی بنیاد رکھتا ہے بلکہ یہ حجت بالغہ، برہان قاطع اور تعلیل واضح کو رہبر بناتا ہے۔ اور ان کی وساطت سے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ منقولات کی اساس مقولات ہیں نیز نقل صحیح، کبھی عقل صریح کی مخالفت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے

میں تو ہمیں جا بجا وجود باری تعالیٰ، اُس کی وحدانیت، اُحیائے موتی اور دوسری بنیادی تعلیماتِ نفس و آفاق کے دلائل سے مدلل ملتی ہیں۔ اور یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ ایمان جس چیز کا نام ہے وہ دلیل و محبت سے عبارت ہے، اُسے جہالت، تعصب، ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید سے کوئی سروکار نہیں۔

(۷) عقیدہ وسط و اعتدال یہ عقیدہ خدا کے منکرین اور بے شمار خداؤں کے قائلین کے بین میں ایک مسلک اعتدال پیش کرتا ہے۔ اور وہ ہے مسلک لا الہ الا اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی طرح صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں فلسفہ یونان کے سببی تخیلات اور تشبیہ و مجسم کے ایجابی نظریات کے مقابلے میں عقیدہ اسلام ایک طرف لبس کمشلہ شیئی اور ولہ یکن لہ کفواً احد کہہ کر مشتبہین کی تردید کرتا ہے اور دوسری طرف فلسفہ یونان کی تعلیط کرتے ہوئے ذاتِ حق کو حقیقی و قیوم، علیم و جبر، سمیع و بصیر اور فعال لما یرید بھی بتاتا ہے اور بے شمار دوسری صفات کا بھی اثبات کرتا ہے۔ ایک بے شعور آدمی جو ہر بات میں آبا و اجداد کی پیروی کرتا ہے اور کبھی عقل سے کام نہیں لیتا اور ایک عقل پرست جو ہر چیز کی تک پہنچنے کی دھن میں حقیقت و ماہیت کو ہتھیت کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ دونوں کو یہ عقیدہ راہِ اعتدال پر لاتا ہے پہلے کے لیے اس کی تعلیم ہے کِتَابُ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مَبَارَكٌ لِّیَدِّ بَرِّوْا اٰتِیْہٖ وَ لَیَنْتَذِرُنَّ کُوْا وَاْلَا بُکَابِ (ص ۲۹) یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے (اے محمد) ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔ اور دوسرے کو کہتا ہے: تفکروا فی خلقِ اللہ ولا تفکروا فی اللہ فتنھلکوا (حدیثِ رسول)۔ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء میں ضرور غور و فکر کریں لیکن ذاتِ حق کے بارے میں عقل کے گھوڑے نہ دوڑاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہلاک ہو جاؤ۔ دوسرے عقائد کے مقابلے میں نہ تو یہ کمزوری و بزدلی دکھاتا ہے اور نہ غلبہ و استیلا کی صورت میں مخالفتِ نظریات کا بھروسہ قوتِ خاتمہ چاہتا ہے۔ بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اس کی تعلیم میں کتنا توازن ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَلَا تَسْتَخِفَّنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الرؤم: ۶۰) پس اُسے نبی صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور تمہیں ہرگز ہلکا نہ پائیں وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔ اور دوسری طرف بڑی فراخ دلی سے اعلان کرتا ہے لَا اَکْفَاہُ فِی الدِّیْنِ اِلَّا کُمْ وَ دِیْنُکُمْ وِلَیِّیْنَ

داکفرون: ہم)۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ نیز تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔
 انبیاء و رسل کے بارے میں دنیا افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے بعض غالی معتقد انہیں درجہ
 الوہیت پر فائز کر دیتے ہیں جبکہ بعض دوسرے بد باطن اور غیث فطرت لوگ انہیں اتباع شہوت
 اور ارتکاب منکرات کی پستیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ لیکن عقیدہ اسلام ان کو نہایت پاکیزہ عفت
 عصمت کے پیکر، تمام انسانوں سے افضل اور خدا کے محبوب بندوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔
 جنہیں اللہ تعالیٰ نے وحی و رسالت کے لیے انسانوں ہی کے اندر سے منتخب کر لیا ہوتا ہے۔ اس
 لحاظ سے بھی یہ عقیدہ ایک عقیدہ وسط ہے۔ جبر و اختیار کے دو انتہائی نظریات میں بھی یہ
 ایک بیچ کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کی نظر میں انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ مختار مطلق۔ اس کی رُو سے
 کائنات میں ایک با اختیار سستی تو وہ ہے جو تمام اختیارات کا سرچشمہ ہے اور جس کے اختیارات
 لا محدود ہیں اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اور دوسری با اختیار سستی خود انسان ہے جس کا اختیار
 محدود ہے اور جو سر اسر اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے تابع ہے پس انسان اختیار سے بہرہ ور
 تو ہے لیکن یہ اختیار خدا کا عطا کردہ ہے لہذا لا محدود نہیں اور اس کی بالکل نفی بھی غلط ہے۔ دَمَا
 تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ۔

عقیدہ اسلام کا جتنا گہرا مطالعہ کرتے چلے جائیے اس کا افراط و تفریط سے پاک کردار سامنے
 آتا جاتے گا۔ اس کی کسی تعلیم کو اٹھا کر دیکھ لو، انسانیت کو انتہا پسندی سے بچا کر حقیقت پسندی
 کی راہ اعتدال کا شعور بخشی نظر آتے گی۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔